خدمتِ انسان
بندگیِ رب

خرم مرادؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے، انسان کے ساتھ تعلق کا موضوع فطری طور پر سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس تعلق کی روح محبت و خدمت ہے۔

انسان کے ساتھ تعلق دینی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔ مگر آج کے مروجہ دین میں بھی، اور ان کے ہاں بھی جو پورے دین کی اقامت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں، اس کی اہمیت بہت کم ہوگئی ہے۔ عام مروجہ دین کا جو ظہور عملی زندگی میں نظر آتا ہے، اس میں تو دینی زندگی کو مراسم عبودیت، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اس قسم کے دوسرے مراسم تک محدود کر دیا گیا ہے۔ جہاں مکمل دین کو قائم کرنے کا دعویٰ اور مقصد ہے، اور اس میں جہاد کو شامل کیا گیا ہے، وہاں اس کے باوجود انسان کے ساتھ تعلق کی جو اہمیت دین میں ہے، وہ اہمیت اسے حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دین پوری زندگی کا نظام ہے ...اور یہی وہ اعلان ہے، جس پر اقامتِ دین اور جہاد فی سبیل اللہ کی تحریک قائم ہوئی ہے ...تو ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ انسان کی زندگی تقریباً ساری کی ساری انسانی روابط کا مجموعہ ہے۔ انسان دنیا میں پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے، جب دو انسان ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک خاندان بناتے ہیں۔ انسان کا بچہ اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے اور اس کی پرورش ہو سکتی ہے، جب دو انسان مل کر اس کی خدمت کریں اور اس کو زندگی کا سامان بہم پہنچائیں۔ اس کے بعد بھی اس کی پوری زندگی دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات سے عبارت ہے۔ ہم اقامتِ دین کے ضمن میں معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام اور اس قسم کے دیگر نظاموں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب نظام بھی انسان اور انسان کے تعلق، ان کے درمیان روابط، اور ان کے درمیان خیالات اور مال اور اشیا اور دوسری چیزوں کے تبادلے سے وجود میں آتے ہیں۔

اس لحاظ سے اگر پورے دین کی اقامت مقصود ہو، تو جہاں یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے

دل میں، اور اپنی ذاتی زندگی میں، ہر جگہ اللہ کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کے روابط اور تعلقات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق قائم ہوں۔ ایک لحاظ سے آپ غور کریں تو اقامت دین کی ساری جدوجہد بھی دراصل انسان کی خدمت ومحبت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے کہ اقامت دین کی جدوجہد اس لیے ہے کہ اس دنیا میں انسان عدل و انصاف کی نعمت سے بہرہ ور ہوں، ان کی زندگی سکون سے اور رحمت سے بھر جائے، وہ یہاں آسایش کے ساتھ اور فراخی کے ساتھ زندگی گزار سکیں، اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ سکیں۔ یہی بات نبی کریمؐ نے اس طرح فرمائی ہے: ''میری اور تمھاری مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے آگ جلائی اور سارا ماحول روشن ہوگیا، تو پرندے اور کیڑے جو آگ میں گرتے ہیں وہ آگ میں گرنے لگے، اور میں ان کو پکڑ پکڑ کر بچا رہا ہوں۔ اسی طرح میں تمھاری کمریں پکڑ پکڑ کر کہتا ہوں کہ اللہ کے بندو آگ سے بچو! اور تم ہو کہ مجھے نظرانداز کر کے آگ میں گرے جا رہے ہو۔''

جو داعی بھی دین کی اقامت اور دعوت اور شہادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اس کی بنیاد انسان کا یہی درد اور سوز ہے۔ اسی سے دعوت کے اندر وہ کیف اور وہ اثر اور وہ کشش پیدا ہوتی ہے، جس سے انسان اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ خشک دعوت انسانوں کے دلوں پر کبھی بھی اثر نہیں کرتی جب تک کہ اس کے اندر ان کے لیے محبت اور سوز و درد نہ ہو۔ قرآن مجید نے ہر نبی کے اسوۂ دعوت میں گم راہ سے گم راہ قوموں کے لیے بھی نبی کا سوز و درد اور ان کے لیے محبت رسول کو واضح کیا ہے۔ داعی کی حیثیت سے اور اقامت دین کے مجاہد کی حیثیت سے، انسان کی خدمت اور دنیا کے اندر اس کو عدل و انصاف سے بہرہ ور کرنے کے لیے اور آخرت میں اس کو جہنم کے عذاب سے بچانے کے لیے جو تڑپ ہونا چاہیے، وہی دراصل خدمت کی بنیاد بنتی ہے، اور اگر نہ ہو تو اس کو بننا چاہیے۔

دین کی اقامت ان کے لیے نہیں ہے جو دنیا میں اپنی بلندی، اپنا غلبہ اور اپنی حکومت چاہتے ہیں۔ اہل ایمان تو وہ ہیں جو اس بات سے بالا ہوتے ہیں اور انسانوں کے خادم بن کر ان کے اوپر حکومت کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے تو کہا ہے کہ جو زمین میں اپنی بڑائی اور اپنا غلبہ و استیلا نہیں چاہتے، اور نہ بگاڑ چاہتے ہیں، ہم نے ان کے لیے آخرت مخصوص کر رکھی ہے۔ ہمارے دور اول کے حکمرانوں نے یہی بات ثابت کی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ جب کسی عامل

نے انھیں لکھا کہ آپ نے جزیہ معاف کر دیا تو بیت المال خالی ہو جائے گا۔ اس پر انھوں نے کہا: ''اللہ نے اپنے نبی کو ٹیکس کلکٹر بنا کر نہیں بھیجا تھا بلکہ ہادی بنا کر بھیجا تھا۔ اگر خزانہ خالی ہو جائے تو اس میں جھاڑو دے کر تالا ڈال دو۔'' ہم حکومت اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ لوگوں سے ٹیکس جمع کریں، بلکہ اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کو صحیح راہ پر لگانا ہے۔ دراصل اقامتِ دین، جہاد اور دعوت کے اندر یہی مقصد اور نظریہ کارفرما ہے۔ انسان سے ہمدردی، اس کے لیے سوز و محبت، اس کی گم راہی پر پریشانی، اور اپنی ذات کے لیے اللہ کی رضا اور اس کی جنت کا حصول، اس کا اصل محرک ہے۔

قرآن مجید نے روابط کے اس نظام کو اللہ کی سب سے نمایاں صفت یعنی رحمٰن کی صفت پر قائم کیا ہے۔ مختلف احادیث میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور نبی کریمؐ کا اسوہ بھی رحمت کا مظہر ہے۔ خود قرآن مجید میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول خداؐ مومنین کے لیے رؤف و رحیم ہیں، سراپا شفقت اور سراپا رحمت اور سارے عالمین کے لیے بھی رحمت ہیں۔

نبی کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کی رحمت، اور ایک انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ رحمت کے تعلق کو مختلف احادیث کے اندر مختلف پیرائے میں اور مختلف اسلوب میں بیان کیا ہے۔ مثلاً: من لا یرحم لا یرحم ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا...'' یعنی جو لوگوں پر رحم نہیں کرتے، ان کے ساتھ رحمت و شفقت کا برتاؤ نہیں کرتے، ان پر اللہ بھی رحم نہیں کرے گا۔ ''جو لوگوں پر رحمت کرنے والے ہیں، ان کے اوپر رحمٰن رحم کرے گا۔'' ''ان لوگوں پر رحم کرو جو زمین میں ہیں، جو آسمان پر ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔'' اس طرح سے ایک نہیں بے شمار احادیث ہیں، جن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ انسانی روابط کو اللہ کی رحمٰن و رحیم ہونے کی صفت کے سانچے میں ڈھلنا چاہیے۔ مومنین کے لیے قرآن نے خود واضح کر دیا: رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (الفتح:۲۹) ''کہ وہ ایک دوسرے کے لیے سراپا رحمت ہیں۔'' مسلمان، مسلمانوں کی جماعت، مسلمانوں کی امت ایک دوسرے کے لیے اور بنی نوع انسان کے لیے بھی سراپا رحمت ہیں۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ یعنی اللہ کی مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ اور اس کا خاندان ہے اور اللہ کو اپنے کنبے اور خاندان میں وہی فرد سب سے بڑھ کر محبوب ہے جو اس کے خاندان کے ساتھ اچھا سلوک کرے، احسان کرے اور نیکی کرے۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ انسانوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا برتاؤ ہو۔ رحمت تعلق کا بنیادی سانچہ ہے۔ اگر ہم اس کو مزید تقسیم کرنا چاہیں تو دو اصولوں کے

تحت تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان انسانوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے، ان کی خدمت کرے، ان کی بھلائی کرے، ان کے کام آئے، ان کی حاجتیں پوری کرے، ان کے غم اور افکار کو دور کرے اور ان کے رنج کو ہلکا کرے۔ یہ مثبت پہلو ہے، دوسرا منفی پہلو ہے۔ وہ یہ کہ ایک انسان دوسرے انسان کو تکلیف اور ایذا نہ پہنچائے۔ انسانوں کے ساتھ تعلق کے جو بھی پہلو آئیں گے وہ اسی مثبت اور منفی، ان دو پہلوؤں سے مل کر عبارت ہوں گے۔

کسی کا حق مارنا، اس کو ایذا پہنچانا ہے۔ اسی لیے کسی کا حق مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر آپ شریعت کی تعلیمات پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ شریعت کی بہت چھوٹی چھوٹی تعلیمات بھی اسی اصول پر مبنی ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو تکلیف پہنچانے کا ذریعہ نہ بنے۔ مثلاً اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے کی چیز بغیر اجازت کے لی جائے، اس لیے کہ اس سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے۔ ایسا مذاق کرنے سے منع کیا گیا ہے، جس سے انسان کو تکلیف پہنچے۔ تین آدمی اگر جمع ہوں تو دو آدمی مل کر کوئی سرگوشی نہ کریں، اس لیے کہ اس سے تیسرے کو تکلیف ہوگی۔ گھر میں داخل ہونا ہو، تو سلام کر کے اجازت لو، اس کی بنیاد بھی یہ ہے کہ ایسا نہ کرنے سے اہل خانہ کو تکلیف پہنچے گی۔ کسی کے گھر میں کھانا کھا کر اتنی دیر نہ بیٹھا جائے کہ میزبان کو تکلیف ہونے لگے۔

تمام معاشرتی رسم و رواج اور آداب کی تعلیمات میں یہی اصول کارفرما ہے کہ تمھاری کسی روش سے، کسی قول سے، کسی عمل سے کسی دوسرے انسان کو ایذا نہ پہنچے۔ اس میں حقوق کی ادائی بالکل بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جو حقوق عائد کیے گئے ہیں، انھیں ادا کیا جائے، آدمی ظلم کی راہ پر نہ چلے اور کسی کا حق نہ مارے۔ کسی کی جان، مال، عزت و آبرو کو پامال نہ کیا جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے آخری خطبہ میں حج کے موقع پر کھڑے ہو کر واضح طور پر فرمایا تھا کہ "آج سے تمھاری جانیں، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔" دین میں، احادیث میں، قرآن مجید کی تعلیمات میں، آداب میں اور چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں یہی فلسفہ کام کرتا ہے کہ انسان کوئی ایسا کام نہ کرے، جس سے دوسرے انسان کو ایذا پہنچے، الا یہ کہ جہاں شریعت سے ثابت ہو جائے کہ جان لینا جائز ہے، وہاں جان لینے کی اجازت ہے۔

اس میں بھی احادیث میں یہ آتا ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نبی ﷺ کے سامنے کوئی

قصاص کا مقدمہ آیا ہو اور آپ ﷺ نے فریقین کو یہ نصیحت نہ کی ہو کہ دیکھو قصاص نہ لو بلکہ معاملے کو ایسے ہی طے کر لو۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ کوئی ایسا مقدمہ نہیں جو رسولؐ کے پاس آیا ہو، جس میں آپ ﷺ نے دونوں فریقین کو یہ نصیحت نہ کی ہو کہ دیکھو جان کا مطالبہ کرنے کے بجائے اس معاملے کو دیت کے ذریعے طے کر لو۔ جہاں حکم بھی دیا گیا ہے اور حق ثابت بھی ہو جاتا ہے وہاں بھی یہ نصیحت کی جاتی ہے۔ جہاں نظام باطل کو مٹانے کے لیے اور نظام حق کو قائم کرنے کے لیے اور معاشرے کو بچانے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے، وہاں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔

انسانی تعلقات و روابط کے یہ بنیادی اصول ہیں۔ ان پر تفصیلی غور کی ضرورت ہے۔

پہلا مثبت اصول خدمت کا ہے۔ اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے کہ دین کی کیا تعلیمات ہیں، دین کا کیا مزاج ہے، جب کہ اس کا دوسرا حصہ حقوق کو ادا کر کے ظلم نہ کرنے اور ایذا نہ پہنچانے کا ہے۔ اس کی کیا اہمیت ہے؟ اس بارے میں قرآن و حدیث سے جو تعلیمات ملتی ہیں، ان کو جاننے کی ضرورت ہے۔

خدمت اور نفع کی حد تک قرآن مجید میں انسان کی خدمت اور اس کی حاجت روائی کو اللہ کے اوپر ایمان کے برابر نیک عمل ٹھیرایا ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا احساس ہے کہ قرآن نے دراصل اس بات کا ایمان کے ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔ سورۃ الحاقہ میں ایک گروہ کا ذکر ہے کہ اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ کہا جائے گا کہ اس کو پکڑو اور جکڑو اور جہنم میں ڈال دو۔ اس کی جو چارج شیٹ قرآن نقل کرتا ہے وہ یہ ہے:

اِنَّـهٗ كَانَ لَا يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ الۡعَظِيۡمِۙ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِؕ (الحاقۃ: ۳۳،۳۴)

”یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔“

یہ دو جرائم ہیں: ایک یہ کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔ یعنی کھانا کھلانا تو خیر بہت ہی زیادہ بڑی بات ہے، صرف یہ کہ دوسروں کو کھانا کھلانے کی ترغیب تک نہیں دیتا تھا۔

اسی طرح سورۃ المدثر میں جو ابتدائی سورتوں میں سے ہے، فرمایا: لوگ پوچھیں گے، تم کو کس چیز نے جہنم میں ڈال دیا:

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝
(المدثر: ۴۳-۴۴)

''وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔''

اسی طرح سورۃ الماعون میں آخرت کے عقیدے کو بیان کر کے فرمایا کہ جو آدمی یتیموں کو دھکے دے اور مساکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دے، وہ دراصل آخرت کا انکار کرتا ہے۔ آخرت کا کوئی دعویٰ اس کے ساتھ نہیں چل سکتا کہ آدمی انسان کی خدمت نہ کرے اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرے۔ اسی طریقے سے اللہ کی محبت میں مال دینا اور خرچ کرنا اور مسکینوں کی، یتیموں کی، بیواؤں کی، قیدیوں کی، سب کی خدمت کرنا ہے۔

قرآن مجید کی بے شمار آیات ایمان اور خدمت کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متعلق کرتی ہیں۔ ان کا رشتہ اتنا گہرا قائم کرتی ہیں کہ بعض غیر مسلموں نے، جنھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا یہاں تک کہہ دیا کہ قرآن مجید نے معاشرے کی اصلاح (Social reform) کے لیے ایمان کی بنیاد پر معاشرتی تعلقات (Social relation) کو بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

جگہ جگہ یہ تاکید کی گئی ہے کہ اللہ پر ایمان اس لیے لاؤ تا کہ بندوں کی خدمت ہو اور آخرت پر ایمان اس لیے لاؤ تا کہ انسانوں کی خدمت ہو۔ قرآن نے دونوں کو لازم وملزوم کے طور پر مرتب کیا ہے۔ مختلف احادیث میں مختلف طریقوں سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اصل نیکی یہ ہے کہ انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ فرمایا، کسی نیکی کو حقیر مت جانو خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی ہو، یہاں تک کہ اپنے بھائی سے مسکرا کر ملنے کو اور ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ ملنے کو بھی حقیر مت جانو۔

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ میں نے ایک آدمی کو جنت میں چلتے پھرتے مزے کرتے دیکھا۔ معلوم کیا کہ جنت میں کیسے پہنچا؟ تو معلوم ہوا کہ راستے میں درخت تھا جو لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف دیتا تھا۔ اس نے وہ درخت کاٹ دیا اور اللہ نے اس کے بدلے میں اسے جنت عطا کر دی۔

ہمارے محدثین نے ایک پورا باب مختلف عنوانات سے اس پر باندھا ہے۔ مشکوٰۃ میں ''خیرات وصدقے کی فضیلت'' اور ریاض الصالحین میں نیکی کے طریقوں کا بہ کثرت تذکرہ ملتا ہے۔ ان سب میں یہی بات ہے کہ ہر آدمی کو خیرات کرنا چاہیے، صدقہ دینا چاہیے۔ ایک صحابیؓ

نے پوچھا کہ اگر میرے پاس کچھ نہ ہو؟ تو آپ ﷺ نے کہا: دونوں ہاتھوں سے کماؤ، اپنے اوپر بھی خرچ کرو اور دوسروں پر بھی۔ اس نے کہا: یہ بھی میں نہیں کرسکتا تو پھر آپ ﷺ نے کہا: اگر کوئی آدمی حاجت مند ہے اور کسی غم میں مبتلا ہے تو اس کی مدد کرو۔ اس نے کہا: میں یہ بھی نہیں کرسکتا۔ تو آخر میں آپ ﷺ نے کہا: پھر اپنے شر سے دوسروں کو بچاؤ، کم از کم اتنا تو بھلا کام کرو۔ انسانوں کی خدمت کا یہ وہ کردار ہے جو سب سے نمایاں ہے اور جو مطلوب ہے۔

امام بخاریؒ نے نزولِ وحی کے باب میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ نزولِ وحی کے بعد رسول کریمؐ غارِ حرا سے واپس کانپتے ہوئے آئے اور اپنی بیوی سے کہا: زملونی، زملونی "مجھے اوڑھادو، مجھے اوڑھادو۔" انھوں نے کمبل اوڑھایا اور کچھ اطمینان ہوا تو آپؐ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنا پورا واقعہ بیان کیا۔ پھر کہا: قد خشیت علی نفسی "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔" آپؐ نے یہ بات اپنے منصب کی عظمت، اس کی بڑائی اور آنے والے خطرات کے پیشِ نظر اپنے احساس کے تحت فرمائی تھی۔ اس پر ان کی بیوی کیا فرماتی ہیں: اللہ کی قسم! اللہ آپؐ کو ضائع نہیں کرے گا، یا یہ فرمایا کہ اللہ آپ ﷺ کو نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، اقربا کے حقوق ادا کرتے ہیں، وہ لوگ جن کا بوجھ اٹھانے کے لیے کوئی تیار نہیں، ان کا آپؐ بوجھ اٹھاتے ہیں، اور جن کے پاس کچھ نہیں، ان کے لیے آپ ﷺ کما کر دیتے ہیں اور مہمانوں کا آپؐ اکرام کرتے ہیں اور حق کے راستے میں جو مشکلات ہوتی ہیں ان میں آپ ﷺ دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ آپ ﷺ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا... یہ آپ ﷺ کا قبل نبوت کا کردار ہے جو آپ ﷺ کی بیوی کے الفاظ میں کھل کر سامنے آتا ہے۔

ایک دوسرے واقعے میں، حضرت جعفر طیارؓ نجاشی کے دربار میں کھڑے ہیں۔ اس نے پوچھا: تمھارا دین کیا ہے؟ بڑا نازک موقع تھا۔ بین الاقوامی سطح پر، اسلام کے تعارف کا پہلا موقع تھا۔ ان کی جان بھی خطرے میں تھی، اس لیے کہ کفارِ قریش کا وفد دربار میں موجود تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یہ ہمارے بھاگے ہوئے لوگ ہیں، آپ ان کو واپس کر دیں۔ ایسی صورت حال میں حضرت جعفر طیارؓ نے کہا: اے بادشاہ! ہم بتوں کو پوجتے تھے، جھوٹ بولتے تھے، مردار کھاتے تھے اور بیواؤں، اور یتیموں پر ظلم کرتے تھے۔ ہمارے درمیان ایک شخص آیا۔ اس نے کہا کہ پتھروں کو پوجنا چھوڑ دو، سچ بولو، ہمسایوں کی مدد کرو، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرو، اور نیک راہ اختیار کرو۔

یہ دین کا تعارف ہے جو بالکل ابتدائی دور میں ایک صحابی کراتے ہیں کہ یہ اصل دین ہے جو ہم کو سکھایا گیا ہے اور جس نے ہماری زندگی بدل دی ہے۔ بتوں کی پوجا چھوڑنے کے ساتھ فوراً سچ بولنا، بیواؤں اور یتیموں کی خدمت کرنا، ہمسایوں کی خدمت کرنا اور عورتوں کی پاک دامنی کے اوپر داغ نہ لگانا، بدکاری سے پرہیز کرنا، یہ وہ صفات تھیں جو انھوں نے بیان کیں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو دراصل دین کا یہ پہلو کہ انسان کی خدمت کی جائے اور ہر لحاظ سے اس کی مدد کی جائے، یہ سارے انسانوں کے لیے عام ہے۔

مسلمانوں کو تو ایک دوسرے سے خیر خواہی، محبت اور باہمی ہم دردی کے لیے احادیث کے اندر اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ترغیب دی گئی ہے۔ مثلاً جو مومن کی کسی تکلیف کو دور کرے گا، اللہ قیامت کے روز اس کی تکالیف میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا۔ جو مومن کے کسی عیب کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ قیامت کے روز اس کی خامیوں اور گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔

مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے وہ اس کی مدد کرے۔ جب تک بندہ اپنے کسی بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے، اللہ اس کی مدد کرتا رہتا ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے بھائی کی مدد کرے، اس کی حاجت پوری کرے۔

دین کا جو رسمی تصور ہے، اگر اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو یہ احادیث سامنے آئیں گی کہ نبی کریم ﷺ مصلے پر کھڑے ہیں، اور اقامت کہہ چکے ہیں کہ ایک عورت آتی ہے کہ آپ ﷺ چل کر میرا یہ کام کر دیں۔ آپ ﷺ جماعت چھوڑ کر اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ اس کا کام کرتے ہیں اور پھر آ کر جماعت کراتے ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور میرا ارادہ ہوتا ہے کہ طویل نماز پڑھوں، پھر کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ اس کی ماں کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ چناں چہ میں نماز کو مختصر کر دیتا ہوں۔ یہ نہیں کہ ماں کو ڈانٹ پھٹکار ہوگی کہ بچے کو رونے کے لیے تم یہاں کیوں لے آئی ہو بلکہ بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو آپ ﷺ نماز مختصر کر دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں مسجد نبویؐ میں دو مہینے اعتکاف کروں، اس سے زیادہ مجھے یہ محبوب ہے کہ میں ایک گھڑی کے لیے جاؤں اور کسی مسلمان کی خدمت کروں اور اس کی مدد کروں۔

آپ ﷺ کا یہ فیض سب کے لیے عام تھا۔ کافر، مشرک، یہودی، عیسائی جو بھی آتے

تھے، ان کے ساتھ آپ ﷺ کا سلوک یہی تھا۔ عیسائیوں کا وفد آیا تو آپ ﷺ نے مسجد نبویؐ میں ٹھیرایا۔ ان کے لیے بہترین کھانے پکوائے۔ انھوں نے اپنی عبادت کرنا چاہی تو مسجد نبویؐ میں عبادت کرنے کی اجازت دی کہ تم اپنی عبادت یہاں کر سکتے ہو۔ یہ آپ ﷺ کا اخلاق تھا، رواداری اور رحمت تھی۔ یہ اس خدمت کا اثر تھا کہ لوگ کثرت کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ جو لوگ قرآن سن کر ایمان لائے ان کی تعداد تو بہت تھوڑی ہے، آپ انگلیوں پر گن سکتے ہیں، لیکن وہ لوگ جنھوں نے نبی کریمؐ کی شان رحمت دیکھی اور ستم زدہ انسانوں کے ساتھ حسن سلوک دیکھا اور ایمان لائے ان کی تعداد لامتناہی ہے۔ آج بھی جو لوگ ایمان لاتے ہیں، ان ایمان لانے والوں میں زیادہ تعداد ان کی ہے، جو حضورؐ کی سیرت سے، آپ ﷺ کی رحمت سے، آپ ﷺ کی انسان دوستی سے، اور آپ ﷺ کے انسانوں کے ساتھ تعلق سے متاثر ہو کر ایمان لاتے ہیں۔ برسوں اور صدیوں سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ دور اول میں بھی یہی تھا کہ لوگ آ کر آپ ﷺ کا چہرہ دیکھتے تھے اور جا کر کہتے تھے کہ یہ آدمی تو اتنا فیاض ہے، اتنا بخشنے والا ہے، اور اتنا معاف کرنے والا ہے، اس پر تو ہم ضرور ایمان لائیں گے۔ یہ انسان کے ساتھ محبت و تعلق کی وہ کیفیت ہے جو قرآن و حدیث سے واضح ہوتی ہے۔

اس بات کی اس قدر اہمیت اس لیے ہے کہ دراصل اللہ تعالیٰ نے جو بھی عبادتیں لازم کی ہیں، وہ اپنے لیے نہیں کی ہیں، اسے کسی عبادت کی حاجت نہیں ہے۔ اس کو سجدے کی اور رکوع کی، اور تسبیح کی اور تقدیس کی کوئی ضرورت نہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ آسمان کے اوپر چار انگل جگہ بھی خالی نہیں، جہاں کوئی فرشتہ اللہ کی عبادت نہ کر رہا ہو۔ فرشتوں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ہم تو آپ کی تسبیح کرتے ہیں، تقدیس بھی کرتے ہیں، پھر آپ نئی مخلوق کیوں بنا رہے ہیں؟ اس کو آپ اختیار اور آزادی دیں گے، وہاں جا کر بھائی بھائی کا خون بہائے گا اور بھائی بھائی کی زندگی کو بگاڑے گا۔ یہ تو زمین میں فساد مچائے گا۔ اگر آپ کو یہی مطلوب ہے کہ آپ کی بندگی اور پرستش ہو، یہ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ مگر یہ اللہ کو مطلوب نہیں ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ انسان، انسان کے لیے انسان اور رحمت کا فرشتہ بنے۔ اسی لیے انسان کی خدمت ساری عبادات کے اوپر بھاری ہے۔

انسان کا حق مارنا اور اس کو ایذا اور تکلیف پہنچانا، ساری عبادات کو زائل کرنے والی چیز ہے۔ چناں چہ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز آدمی کے نامۂ اعمال کے تین حصے ہوں گے،

الگ الگ تین پرتیں ہوں گی۔ ایک فائل ہوگی جس میں وہ چیز ہوگی کہ جس کو اللہ ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ ایک وہ فائل ہوگی، جس کی اللہ کو کوئی پرواہ نہیں ہوگی کہ اس کے اندر کیا لکھا ہوا ہے۔ ایک تیسری فائل وہ ہوگی جس میں سے وہ ایک حرف بھی نہیں چھوڑے گا، جس کا کہ حساب نہ لے۔ پہلی فائل کے اندر اللہ کے ساتھ شرک ہوگا، جس کو وہ معاف نہیں کرے گا۔ دوسری فائل میں جس کی اس کو کوئی پروا نہیں ہوگی، یہ وہ معاملات ہیں، جو انسان کے اپنے نفس یا اللہ کے ساتھ ہیں، یعنی نماز نہیں پڑھی، روزہ چھوٹ گیا یا کچھ اور ہو گیا، اس کی اللہ کوئی پروا نہیں کرے گا۔ اگر چاہے گا تو بخش دے گا اور چاہے گا تو پوچھ گچھ کرے گا۔

تیسری فائل جس کا وہ ایک حرف بھی نہیں چھوڑے گا، وہ ہے جس میں انسان اور انسان کے باہمی حقوق اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی اور باہمی معاملات و تعلقات کا بیان ہوگا۔ اس نامۂ اعمال سے وہ ایک حرف بھی اپنے ذمے نہیں لے گا۔ یا تو مدعی کا اور مظلوم کا حق ادا کرے گا یا اگر بندہ کسی اور وجہ سے بڑا محبوب اور پیارا ہوگا، تو وہ مدعی کو کچھ اور دے کر راضی کرے گا تاکہ وہ معاف کر دے۔ لیکن وہ خود سے معاف نہیں کرے گا کہ میں نے معاف کر دیا۔

اس بات کو انتہائی موثر انداز میں ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ سوالیہ انداز میں، اور یہ آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت کا عام انداز تھا کہ آپ ﷺ سوال کر کے لوگوں کے ذہنوں کو چونکاتے تھے، پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ میری امت کے اندر مفلس (غریب) آدمی کون ہے؟ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ نے سوچ کر کہا کہ مفلس تو وہ ہے، جس کے پاس روپے پیسے نہ ہوں، مال و متاع نہ ہو۔ آپؐ نے کہا کہ میری اُمت کا مفلس اور غریب وہ نہیں ہے بلکہ میری امت کا مفلس تو وہ ہے جو قیامت کے روز آئے گا، بہت ساری نمازیں اور بہت سارے روزے اور بہت سارے صدقات جمع کر کے لائے گا مگر اس طرح آئے گا کہ کسی کو برا بھلا کہا ہوگا، کسی کو گالی دی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا۔ اس کے بعد اللہ کے حضور سارے مدعی کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر مختلف مدعیوں کو اس کی نیکیاں بانٹ دی جائیں گی، یہاں تک کہ جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی، تو پھر ان مدعیوں کے گناہ لے کر اس کے سر پر ڈال دیے جائیں گے کہ اب اس معاملے کو طے کرنے کے لیے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ پھر اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

نماز، روزہ اور صدقات کے باوجود یہ معاملہ ہوگا۔ اس لیے کہ یہ وہ دن ہوگا جب درہم و دینار کام نہیں آئیں گے۔ آخرت میں جرمانے کے معاملات کو طے کرنے کے لیے جو کرنسی چلے گی وہ مال و اسباب کی نہیں بلکہ نیک اعمال کی کرنسی ہوگی۔ آدمی کو اسی کرنسی اور سکے کے ذریعے معاملے طے کرنا پڑے گا۔ یہاں قتل کی اور دوسری چیزوں کی آدمی مال سے دیت ادا کرسکتا ہے۔ لیکن وہاں مال سے ادا کرنے کا موقع نہیں ہوگا۔ وہاں نیک اعمال ہی وزن رکھیں گے اور سارے نیک اعمال سے ان برے اعمال اور غصب شدہ حقوق کو ادا کرنا ہوگا۔

انسانی حقوق اور انسانی جان کی اس قدر اہمیت ہے کہ قرآن میں فرمایا گیا کہ جس نے ایک جان کو بھی بے گناہ مارا اس نے گویا سارے انسانوں کو ختم کردیا، اور جس نے ایک انسان کو بھی زندہ رکھا گویا اس نے سارے انسانوں کو زندہ رکھا۔ جہاں مومن کے قتل کا ذکر ہے وہاں تو عجیب انداز بیان ہے۔ یعنی جس سے قتل خطا ہوگیا وہ کم سے کم ایک غلام کو آزاد کردے اور اس کا فدیہ دے اور جس نے جان بوجھ کر مارا تو اس کے لیے قرآن نہ کسی فدیے کا ذکر کرتا ہے نہ کسی معاوضے کا، بلکہ کہتا ہے کہ ہم اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دیں گے۔ یعنی قتل عمد کی سزا کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اس کا کوئی مداوا ہوسکے بلکہ خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ اس کی سزا تو پھر یہی ہے کہ مقتول کے وارث معاف کردیں یا پھر آدمی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جلے۔ اللہ نے قانون قصاص کو کس حکمت سے بیان کیا ہے کہ پہلے مال کی حرمت قائم کی، اور پھر جان کی حرمت قائم کی۔ اس کے بعد جان و مال کے ساتھ جسم کے سارے اعضا کی حرمت قائم کی۔ اَلنَّفُسَ بِالنَّفُسِ لا وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ...وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ، اور جان کے بدلے جان کان کے بدلے کان۔ گویا اس نے پورا قصاص کا قانون نافذ کیا اور کہا کہ امت کے لیے زندگی اگر ہے تو اسی قصاص کے قانون میں ہے۔ اس کے بعد مال کی حرمت قائم کی کہ ایک انسان کا پیسہ دوسرے کے اوپر حرام ہے۔ معمولی سے معمولی رقم اور زمین کا ایک ٹکڑا بھی اگر کسی نے دبالیا تو وہ اس دن آگ کا طوق بن کر اس کے گلے میں لٹک جائے گا۔ اگر کسی نے مالِ غنیمت میں سے کوئی ایک عبا بھی چوری کرلی تو فرمایا گیا کہ تم اس کو شہید کہتے ہو، یہ تو جہنم میں جائے گا۔ اس لیے کہ اس نے مالِ غنیمت سے چوری کی۔

وہ مال جو کہ کسی دوسرے کی ملکیت ہو، یا جو جماعت کی ملکیت ہو، اس کا ناجائز کھانا اور

حرام کھانا، اس کے بارے میں اتنی سخت وعید کی گئی ہے۔ اس کے بعد عزت و آبرو کو حرام کیا۔ مسلمان، مسلمان کے ساتھ تمسخر نہ کرے، اس کا مذاق نہ اڑائے، اس کو گالی نہ دے، اس کی غیبت نہ کرے، اس کی تذلیل نہ کرے، اس کی تحقیر نہ کرے اور برا بھلا نہ کہے۔ یہ سارے احکام قرآن مجید نے خود بھی بیان کیے اور حدیث کے اندر بھی ان احکام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اگر آپ ان پر غور کریں تو مثبت و منفی، دو اصول بنتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی خدمت، اس کے ساتھ محبت اور اس کے لیے سوز و درد۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ دراصل اقامتِ دین، جہاد اور دعوت کی بنیاد یہی ہے۔ جب یہ بنیاد زندگی کے اندر رائج ہوگی، جاری و ساری ہوگی، تب ہی انسانوں کے ساتھ وہ تعلق قائم ہو سکے گا کہ انسان اس دعوت پر لبیک کہیں۔ جب تک یہ دعوت کتابوں میں لکھی رہے گی، اور مجرد الفاظ و دلائل کے ساتھ پیش کی جاتی رہے گی، اس وقت تک عام انسان کے لیے اس میں کوئی کشش نہ ہوگی۔ انبیا کی دعوت بھی اسی وقت مقبول ہوئی جب لوگوں نے اپنی آنکھوں سے نبی کے اخلاق اور برتاؤ کو دیکھا۔ انسانوں کی خدمت اور ان کی مدد اور حاجت روائی، خوشی و غمی میں شرکت، اور ان کے ساتھ تعاون، جس طرح بھی ممکن ہو، یہ بڑی عظیم الشان نیکیوں میں سے ہے۔ نماز، روزہ اور زکوٰۃ اور دیگر سب چیزوں سے زیادہ بڑی نیکی اس کو قرار دیا گیا ہے۔

دوسری طرف سب گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ، انسانوں کے حقوق مارنا اور انسانوں کو تکلیف پہنچانا ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے یہاں تک کہا کہ جس نے مسلمان کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی، اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی۔ جس نے مسلمان کو خوش کر دیا اس نے مجھے خوش کر دیا، اور جس نے مجھے خوش کر دیا اس نے اللہ کو خوش کر دیا۔ گویا اللہ کے رسولؐ نے مسلمان کے دل کا، اس کی عزت کا، اس کی تکلیف اور اس کی پریشانی کا براہِ راست رشتہ اپنی ذات کے ساتھ جوڑ کر، پھر اللہ کے ساتھ جوڑا۔ ساری کی ساری، جتنی بھی تعلیمات ہیں ان کو سمیٹ کر ان دو ہی اصولوں کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے، ایک مثبت اور ایک منفی۔

اگر آدمی کے بس میں مثبت نہ ہو، تو جس طرح حدیث میں کہا گیا ہے کہ کم از کم اپنے شر سے لوگوں کو بچاؤ... یہ کم سے کم ہے، جو تم کر سکتے ہو۔ اگر ہاتھ سے کما نہیں سکتے، دینے کے لیے دولت نہیں ہے، چلنے کے لیے سکت نہیں ہے، کسی حاجت مند کی مدد نہیں کر سکتے، تو کم سے کم اپنی

زبان سے ایسی بات نہ کہو، اور اپنے ہاتھ سے ایسا کام نہ کرو، جس سے شر پیدا ہو اور کسی کو تکلیف پہنچے۔ یہ نیکی اور صدقے کا کم سے کم درجہ ہے جو انسان کے بس میں ہے۔ کچھ بھی نہ ہو تو وہ کم سے کم یہ نیکی ضرور کر سکتا ہے۔

مثبت طور پر مدد اور منفی طور پر ایذارسانی سے پرہیز، یہ دراصل اسی رحمت کی دو شاخیں ہیں، جس کے اوپر قرآن نے اللہ کا تعلق بندوں کے ساتھ قائم کیا۔ الرحمٰن، وہ رحمٰن ہے جو بڑی رحمت کرنے والا ہے اور مسلسل رحمت کر رہا ہے۔ وہ رحیم بھی ہے اور اس نے چاہا ہے کہ اس کے بندے بھی آپس میں اسی رحمت کا مظہر ہوں۔ مومن ایک دوسرے کے ساتھ سراپا رحمت ہوں، رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ اور مومن اپنے رسول ﷺ کی پیروی میں دوسرے انسانوں کے لیے بھی سراپا رحمت ہوں۔ رسول اللہؐ رحمۃ للعالمین تھے۔ اہل ایمان کو انسانوں کے لیے بھی سراپا رحمت ہونا چاہیے۔

اللہ سے تعلق کے بعد دعوت کے لیے، اقامت دین کے لیے، جہاد کے لیے اور تنظیم کے لیے، سب سے اہم چیز یہی ہے۔ سب کاموں میں اس کی یہی اہمیت ہے جو ملحوظ رہنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اللہ اگر یہ چاہے گا کہ اس کا نام لینے والے انسانوں کے اوپر حکمراں بنیں تو وہ یہی چاہے گا کہ ایسے نام لینے والے ہوں جو بندوں کے اوپر خدا بننے اور ظالم بننے اور ان کے اوپر دست درازی کرنے والے نہ ہوں بلکہ ایسے لوگ ہوں جو ان سے محبت کرتے ہوں۔ ان کے خادم بنیں اور خادم بن کر خدمت کریں۔ صحابہ کرامؓ نے اسی مقام پر پہنچ کر دنیا کی امامت و حکومت حاصل کی۔ جہاں وہ جاتے تھے بغیر اس کے کہ وہ لڑیں لوگ شہر کے دروازے کھول دیتے تھے، لوگوں کے دل فتح ہو جاتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ طارق بن زیاد چند سو آدمی لے کر اسپین گیا، پورا اسپین فتح کر لیا۔ محمد بن قاسم چند سو آدمی لے کر ہندستان آیا، پورا سندھ فتح کر لیا۔ یہ لڑائی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس وجہ سے تھا کہ یہاں کے باشندے پہلے سے ہی اسلام کے لیے مسخر ہو چکے تھے، ان کے دل اس کے لیے کھل چکے تھے۔ عرب تاجروں کے بھارت سے تعلقات بہت واضح اور صاف تھے، اور اسپین بھی بہت دور نہیں تھا۔ مسلمان لیبیا، تیونس اور مراکش تک پہنچ چکے تھے اور لوگوں کے دل واقف تھے کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک جگہ مسلمانوں کو جنگ کی وجہ سے اپنا شہر خالی کرنا پڑا تو انھوں نے لوگوں سے جو جزیہ وصول کیا تھا وہ لوگوں کو واپس کر دیا۔ عیسائی بھی رونے لگے کہ ایسے لوگ تو ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے درمیان رہیں اور ہمارے اوپر حکومت کریں۔

لوگوں نے دل کھول کر دین کا استقبال کیا، وہ استعمار پسند نہیں تھے۔ جہاں گئے وہیں بس گئے، وہیں شادیاں کیں۔ اس لیے کہ وہ لوگوں کے خادم تھے۔ ان کے حکمراں بھی لوگوں کی خدمت کرتے تھے۔ خود جھوٹا موٹا پہنتے تھے، روکھی سوکھی کھاتے تھے لیکن انسانوں کی خدمت کرتے تھے۔ اس کام کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ یہ کردار اسلام کی انھی تعلیمات کے نتیجے میں ابھرا تھا۔

اسی کردار نے ان کو انسانوں کا محبوب بنا دیا تھا اور رحمٰن کا بھی محبوب بنا دیا تھا۔ جب انسان رحمٰن کا بھی محبوب بن جائے تو کوئی چیز اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ کامیابی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے جتنی ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی اپنی عبادات پر توجہ دے، اپنے اخلاق پر توجہ دے، اللہ کی راہ میں اپنا جان و مال خرچ کرے، وہاں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آدمی کے اپنے کردار کے اندر یہ دو صفات بھی ہوں کہ وہ دوسروں کی خدمت کرے اور انھیں ایذا نہ پہنچائے۔ لوگ یہ محسوس کریں کہ یہ رحمت کے فرشتے ہیں جو ہمارے درمیان چل پھر رہے ہیں۔ ان کے غالب آنے سے اور اوپر آنے سے ہماری زندگی رحمت اور برکت کے ساتھ بھر جائے گی۔

میں نے شروع میں حدیث بیان کی تھی کہ اگر تم زمین والوں پر رحم کرو گے تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا، اور اگر تم زمین والوں پر رحم نہیں کرو گے تو اوپر والا بھی تم پر رحم نہیں کرے گا... یہ بات اگر ہمیشہ سامنے رہے اور کوشش کی جائے کہ اپنے قول و فعل سے دوسرے انسانوں کو تکلیف پہنچانے سے بچا جائے، تو یہ مطلوبہ مومنانہ اور داعیانہ کردار وجود میں آسکتا ہے۔

ہم سب کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لے کر اس پہلو سے اصلاح کریں اور اپنے کردار کی تعمیر کریں۔ انفرادی کردار کی تعمیر یقیناً تعمیر معاشرہ کی بنیاد بن سکتی ہے۔ (ترجمان القرآن، جنوری ۲۰۰۱)
